R. N. 2166/57

Regd. No. A 923

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

Telephone No. 20

Telegrams: "ANJUMAN"

ہماری زبان

جلد ۲۱ - شمارہ ۱۱ | ایڈیٹر آل احمد سرور | علی گڑھ ۱۵ مارچ ۱۹۶۲ء

منوہر پرشاد ماتھر

ہندو خواتین اور اُردو شاعری

ان دنوں ہندی زبان میں اُردو ادب بڑی تیزی سے منتقل ہو رہا ہے اور اردو شاعری کی حد تک تو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندی دنیا نے اسے اپنا لیا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے شعرا کے انتخابات ہندی جگت میں انتہائی مقبول ہو رہے ہیں اور نہ صرف ہمارے اساتذۂ سخن کے دیوان ہندی لپی میں منتقل کئے جا رہے ہیں بلکہ عہد حاضر کے ممتاز شعرا کے مجموعے بھی منظر عام پر ہندی والے ہی لا رہے ہیں ان میں بعض تو ایسے بھی ہیں جن کے اردو زبان میں انتخابات تک شائع نہیں ہوئے۔ ممتاز شاعر مخدوم کا "گل تر" اب ہماری زبان میں "مکتبہ صبا" کی طرف سے پیش کیا گیا ہے جب کہ دو تین سال قبل مخدوم کا ہندی مجموعہ جس میں ان کی تازہ ترین غزلیں بھی شامل تھیں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ یہی نہیں اردو ادب پر مبسوط تحقیقی کتابیں بھی ہندی میں لکھی جانے لگی ہیں حال ہی میں شریمتی ڈاکٹر شکلا نے "تاریخ ادب اُردو" شائع کر کے ہندی ادب میں گراں بہا اضافہ کیا ہے۔

اردو زبان میں اردو شعرا کے تذکروں کی کمی نہیں اور ہر دور میں کوئی نہ کوئی تصنیف ایسی ضرور ملے گی جس میں اس دور کے یا اس وقت تک کے ممتاز شعرا کے تذکرے اور ان کے کلام کا انتخاب شائع کیا گیا ہے ساتھ ہی بعض محققین نے بڑی لگن اور محنت سے مخصوص طبقے کے شعرا تک کے تذکرے شائع کئے ہیں مثلاً "اردو کے ہندو شعرا" "اردو کے یورپی شعرا" "اردو کے عیسائی شعرا" "اردو کے کشمیری ہندو شعرا" "اردو کے دکنی شعرا" وغیرہ حال ہی میں جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اس سلسلے میں "دکھنی ہندو اور اُردو" کے نام سے دکن کے شاعروں اور نثر نگاروں کے مختصر حالات اور نمونہ کلام شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں (۱۲۳) شاعروں کا ذکر ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ خواتین شعرا پر کسی محقق یا مصنف نے کبھی اس قسم کا تذکرہ یا انتخاب وغیرہ کے شائع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی گو کچھ گلدستے یا اس قسم کے مختصر ترین تذکرے شائع ہوئے ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی جیسا کہ ڈاکٹر جعفر حسین صاحب نے لکھا ہے کہ "اس زبان میں سرے سے کسی قابل ذکر شاعرہ کا وجود ہی نہیں ہے اور اس کے ثبوت میں ڈاکٹر صاحب نے یہ کہنا ہی کافی سمجھا کہ اردو ادب کی تواریخ (مثلاً آب حیات مصنفہ محمد حسین آزاد یا گل رعنا مصنفہ عبد الحی صاحب) میں کسی شاعرہ کا ذکر ہی نہیں ہے۔ مگر اتنا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہر دور میں عورتوں نے گیسوئے اردو کو سنوارنے کی اپنی بساط بھر کوششیں ضرور کی ہیں اور آج تو خواتین شعرا کی کمی نظر نہیں آتی۔ بہتوں کا کلام اردو کے مشہور و مقبول جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے کچھ کا "بانو" "خاتون مشرق" "ہم جولی" "حریم" "خزینہ" وغیرہ خواتین کے رسالوں تک محدود ہے۔ غالباً اس سے متاثر ہو کر جناب شاہ نصیر فریدی صاحب نے "ہندو خاتون شعرا کا تذکرہ اور انتخاب" اردو کی پر سند ہندو کاوش کے نام سے ہندی لپی میں شائع کر لیا ہے اور روایتی طور پر انھیں مقبول شعرا کہہ کر کتاب کو محدود کر دینا مناسب سمجھا ہے۔ فریدی صاحب کے اس تذکرے میں کچھ تو عہد رفتہ کی یادگاریں ہیں کچھ صاحب دیوان ہیں کچھ شوقیہ شعر کہنے والیاں ہیں اور دو چار ایسی لڑکیاں بھی ہیں جو شاید مستقبل میں نام کمائیں۔

نہ معلوم کس مفکر نے شاعر کو خالق ہے اور کس منچلے نے اس پھبتی نکالی تھی کہ شاعر اگر خاتون ہو تو اسے خالق کہنا زیادہ حق بجانب نظر

آتا ہے۔ ایسا ہے تو ان ہند و خواتین کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے اپنے روایتی پوجا پاٹ، بچوں کی نگہداشت، شوہر کی خدمت گذاری اور چولہے چکی کی جھنجھٹوں کے باوجود اور تعلیم و اکتساب سے بہت کم علاقہ رکھتے ہوئے بھی اپنے جوہر فطری سے شعر نکھارے ہیں۔ یہ امر ہمارے لئے کس قدر حوصلہ افزا ہے کہ ہمارے باغ کی یہ بلبلیں جن کی نغمہ سنجی خود اُن کی تسکین طبع کے لئے ہوتی رہی ہے، رباب اردو کی زینت کا بھی باعث ہیں جیسا کہ حضرت فراق گورکھپوری نے "حریم ناز" کے مقدمہ میں لکھا ہے: "اردو کے باغ پر بجلیاں گر رہی تھیں لیکن باغ کی بلبل اپنے چہچہوں سے بہار کے گیت گائے جا رہی تھی" ان "پرسدکا وتریون" کے کلام کے مطالعہ کے بعد ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ان بیبیوں نے چار دیواری میں مقید رہنے کے باوجود اپنے کو قفس میں محسوس نہیں کیا بلکہ گوشہ نشینی میں جو کچھ دیکھا یا محسوس کیا اور ماحول سے جو کچھ قبول کیا بڑے دلکش انداز اور پیرائے میں بیان کیا ہے اور اپنے محسوسات کو خلعت جسمانیت دینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس حقیقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ اچھا سے اچھا شاعر جو محسوس کرتا ہے اس کا عشر عشیر بھی صفحہ قرطاس پر وہ منتقل نہیں کر پاتا۔ پھر ان خواتین کی منظومات غزلیات، رباعیات، قطعات وغیرہ پر اجمالی نظر بھی ڈالی جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ ان میں جذبات ہیں، احساس قومیت ہے، اخلاقیت کے درس ہیں، جوش و خروش ہے اور انداز بیان کی ندرت و تازگی بھی ملتی ہے۔ اکثر کے ہاں سلاست و روانی بھی پائی جاتی ہے اور کچھ شوکت الفاظ کی دلدادہ بھی ہیں اور بعض کے اشعار میں معنویت کا دریا لہریں لے رہا ہے۔ ان میں کچھ نے سائنس و فلسفہ کے علاوہ الہیات کے دقیق مسائل میں بھی اپنا دامن الجھا رکھا ہے۔ ان کے رشحات قلم میں کہیں بھی فرسودہ خیالات نہیں ملتے بلکہ اس کے برعکس رنگینی کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور یہاں ہمیں قلم نسوانی حجاب و حیا کی پابندیوں کے ساتھ خوب بچ بچ کر چلا ہے۔ ان کے کلام میں وہی ساقی ہے وہی مے خانہ ہے اور حقائق و معارف کی ویسی ہی گفتگو جیسی غالب نے اختیار کی تھی۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

پران، روپ کنور اور رانی برکت رائے کے نام ان کے حکمت و موعظت سے لبریز بھجنوں اور مرثیوں کے باعث اردو ادب میں ہمیشہ قابل فخر سمجھے جائیں گے۔ روپ کنور کا "ساقی نامہ" اور ان کے مرثیے آج بھی مسلم گھروں میں فخر کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں اور رانی برکت رائے جیکشن باشی حیدرآباد میں گیتا ماتا سے موسوم تھیں۔ انھوں نے کچھ اپنے رنگ کی غزلیں بھی لکھی ہیں۔ ایک شعر ہے ؎

آزمایش صبر کی ہوگی ختم جب دیکھنا
امتحاں ہوگا تمھارا عمر کٹ جانے کے بعد

درگا دیوی ختم اکبرآبادی کو فاضل مصنف نے غالب کا ہم عصر بتایا ہے۔ کچھ روایتیں بھی نقل کی ہیں اور کچھ نوک جھونک بھی۔ معلوم نہیں کہاں تک سچ ہیں ان کے شعر ان کی عظمت کی گواہی دے رہے ہیں ؎

اپنی صورت شاہی دی ہم نے — ان کی اس پر بھی کچھ نظر نہ ہوئی
رہیں اب دیر ہی میں چل کے صنم — اپنی کعبہ میں تو بسر نہ ہوئی

ان کے علاوہ مرحومہ گوپی دیوی ماتھر بیر علی کا انداز بیان بھی شاید پسند آئے ؎

نام ہی نام خضر کا سُن لو — کوئی اپنا تو رہنما نہ ہوا
وہ بشر ہی کیا ذات سے جس کی — دوسرے کا کبھی بھلا نہ ہوا

ان کے علاوہ جناب فریدی صاحب نے ۱۰۱ اور کوتریوں کا ذکر کیا ہے ان میں محترمہ بنجارانی بیزار دہلوی کا نام نامی بھی شامل ہے کیونکہ اس شاعرہ کی عمر اس وقت ۷۰ سال سے بھی تجاوز ہو چکی ہے اور بقول ان کے ؎

آتش عشق سے جل بجھ کے ہوئی خاک مگر — خاک اڑانا نہ میری باد صبا میرے بعد
بیزار اپنا دل ہوا بزم جہان سے — کیا فائدہ بہار میں گلشن سنوار کے

لکھنؤ کی ۶۰ سالہ موہنی دیوی جس کو شاعری ورثہ میں ملی ہے، "درد دل" کے نام سے اپنا مجموعہ شایع کر رہی ہیں ان کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

غفلت میں جو ہوا تھا مجھے اس کا غم نہیں — غم ہے تو یہ کہ ہوش میں آیا تو کیا کیا

ان دونوں علامہ شیشو پرشاد منور لکھنوی کے خاندان سے تعلق رکھنا ہی اچھے شاعر اور باذوق ادیب ہونے کی سند سمجھی جا سکتی ہے اور چندر کلا شرم لکھنوی اور دھرم دیوی لکھنوی ان کے ہی خاندان کے جواہر ہیں اول الذکر کا کلام تو اردو کے مقبول ترین پرچوں میں نمایاں مقام پاتا ہے۔ روحانیت سے بھرپور غزلوں کے علاوہ رباعیات اور سہرے لکھنے میں انھیں کمال حاصل ہے۔ ان کے دو شعر سنئے ؎

تجھے کچھ شرم رکھنا ہے اب اس عزم صمیم کی — سفر تھوڑا سا ہی ہے کارواں باقی جو ہے
تیری قسمت میں نہیں گو فرصت فکر سخن — شرم پھر بھی قابل صد مرحبا سہرا ہے یہ

محترمہ دھرم دیوی کا ایک بلند پایہ شعر ملاحظہ ہو ؎

نہیں معلوم ان دونوں کا بھی کیا بگاڑا ہے — ستاتے ہیں دہر سے یہ زمین و آسماں مجھ کو

محترمہ کنتی دیوی شبنم بریلوی، شاردا دیوی اور آگرہ کے رسالہ "متوال" کی ودیا گوپال انجم نے اردو اور فارسی زبان میں شعر کہے ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں جہاں پاکیزگی اور بلندی خیال ہے وہیں فانی کی طرح حسرت و یاس بھی جھلکتی ہے۔ اس کے برخلاف الہ آباد کی برج کشوری سوشیلا کی نظموں میں طنز و مزاح کے جواہر پائے جاتے ہیں۔ ان پر صرف اکبر کا رنگ ہی غالب نہیں ہے بلکہ وہ اکبر کی آواز بھی بیٹھتی ہیں۔

یہ فصاحت، یہ بلاغت، یہ سلاست آپ کی، اس پہ صورت یہ

سہاگ یہ ہے اکبر کی زبان شریمتی راجیشوری دیوی نہرو صرف ہمارے وزیر اعظم کی رشتہ دار اور ہندوستان کی ممتاز سوشل ورکر ہی نہیں ہیں بلکہ فارسی اور عربی کی تعلیم نے جو انھیں بچپن سے ہی میسر ہوئی تھی انھیں ایک اچھی شاعرہ بھی بنا دیا۔ مگر سماجی کاموں کی وجہ سے فرصت سخن کم نصیب ہوئی ہے ان کا ایک شعر سنئے جو سروجنی نائیڈو کی شان میں پڑھا گیا تھا:

دہن ہے وقت سخن ان کے پھول جھڑتے ہیں — یہ وہ ادا ہے کہ جس پر ہزاروں مرتے ہیں

(بقیہ صفحہ 9 پر)

ہماری زبان

۱۵ مارچ ۱۹۶۲ء

اپنے کو دوسرے کی مدد سے پہچانو

ایک نقاد کا قول ہے کہ انگریزی ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لئے انگلستان کے حدود سے باہر جانا پڑے گا۔ چنانچہ فرانس اور جرمنی کی ادبی تحریکوں کو سمجھے بغیر انگریزی ادب کا عرفان مشکل ہے۔ اسی طرح اردو ادب کو ترقی دینے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہم انگریزی، عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، بنگالی ادبیات میں سے کچھ کا علم رکھتے ہوں۔ ایک زمانہ تھا جب شمالی ہند میں اچھے ادیب اور عالم فارسی، عربی کے علاوہ سنسکرت اور ہندی بھی جانتے تھے۔ کچھ لوگوں نے تو عبرانی اور سریانی بھی سیکھی تھی۔ ہمارے خیال میں اردو ادب میں دستگاہ کے لئے فارسی اور ہندی دونوں پر خاصا عبور ہونا چاہئے۔ اور انگریزی ادب نے جو معیار اور پیمانے دئے ہیں ان سے آشنا ہونا چاہئے۔ ہمارے اچھے ادیب عام طور پر فارسی اور انگریزی جانتے ہیں، مگر ہندی ادب سے واقفیت اتنی گہری نہیں ہے اور سنسکرت سے تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ انگریزی ادب سے جن کو کما حقہ واقفیت ہے ان کی فارسی کے ادب پر گہری نظر نہیں ہے۔ جو عربی و فارسی جانتے ہیں وہ انگریزی برائے نام جانتے ہیں۔ اسی وجہ سے عام طور پر اس دور کے لکھنے والوں کے یہاں زبان پر پوری قدرت نہیں ملتی اور اسی وجہ سے یا تو جو مطلب ایک جملے میں ادا ہو سکتا ہے وہ کئی سطروں میں بیان ہوتا ہے، یا الفاظ کا انتخاب اس قدر ناقص ہوتا ہے کہ کہنے والا کچھ کہنا چاہتا ہے، کہہ کچھ اور جاتا ہے۔ الفاظ پر قدرت کے لئے ہمارے خیال میں ہندی اور فارسی سے اچھی طرح واقف ہونا کافی ہوگا لیکن خیالات اور اسالیب کا علم ایک طرف کچھ مغربی زبانوں کے ذریعہ سے اور دوسری طرف کچھ ہندوستانی زبانوں کے ذریعہ سے آسکتا ہے۔ ٹیگور کی تصانیف کا براہ راست بنگالی سے اردو میں ترجمہ کرنے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح دوسری ہندوستانی زبانوں کے ایسے فاضل جن کی اردو مادری زبان ہو کم ہی ملیں گے۔ ہمیں اس کمی کو دور کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اردو میں روسی، چینی، ہسپانوی زبانیں جاننے والے اور قدیم زبانوں میں یونانی اور لاطینی جاننے والے بھی خاصی تعداد میں ہوتے۔ عام طور پر جب ترجموں کا سوال آتا ہے تو ہمیں انگریزی تراجم کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی میں دوسری زبانوں سے بڑے اچھے ترجمے ہوئے ہیں مگر پھر بھی ان ترجموں میں اصل کی خوبی کی جھلک ہی آسکتی ہے۔ براہ راست ترجموں کی بات ہی اور ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ مغربی زبانوں میں جرمن اور فرنچ جاننے والے ہمارے یہاں خاصی تعداد میں ہیں اور ان لوگوں نے جو براہ راست ترجمے کئے ہیں وہ سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہیں۔ لیکن یہ توقع بے جا نہیں کہ دنیا کی جتنی اہم زبانیں ہیں سب کے جاننے والے ہمارے یہاں ہوں۔ پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ جس طرح سجاد حیدر نے ترکی ادب کی روح اردو میں پھونکی اسی طرح ایسے لکھنے والے بھی ہوں جو ہسپانوی، اطالوی، چینی، روسی، نارویجین زبانیں اچھی طرح جانتے ہوں۔ اور ان کے افکار و اسالیب کو اردو میں منتقل کر سکیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو زبان کی خدمت کے لئے صرف اردو جاننا کافی ہے، انھیں کسی شاعر کا یہ قول یاد رکھنا چاہئے کہ جس نے صرف انگلستان سے محبت کی اس نے انگلستان کو نہیں پہچانا۔

ساہتیہ اکاڈمی کے انعام

امسال ساہتیہ اکاڈمی کا انعام اردو کے مشہور محقق امتیاز علی خاں عرشی کو ان کے دیوان غالب کے ایڈیشن پر ملا ہے ہمیں خوشی ہے کہ اکاڈمی نے اس انعام کے ذریعہ سے اس کتاب کی اہمیت کا اعتراف کیا اور عرشی صاحب کی ادبی خدمات کو سراہا۔ دیوان غالب کا یہ ایڈیشن نہ صرف غالب کے سارے اردو کلام کا سب سے مستند ایڈیشن ہے بلکہ اس میں ایک تاریخی ترتیب بھی ہے اور ایک سیر حاصل دیباچے اور مفید حاشیے نے اس کی خوبی میں اور بھی اضافہ کیا ہے۔ یقین ہے کہ حضرت عرشی کی ادبی خدمت کے اس اعتراف سے پوری اردو دنیا کو مسرت ہوگی۔

ضمناً یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اب تک اکاڈمی نے جتنی کتابوں پر انعامات دئے ہیں ان میں سب سے بڑی تعداد انجمن کی مطبوعات کی ہے۔ انجمن کی مطبوعات کے معیار پر یہ نہایت واضح تبصرہ ہے جس کے متعلق اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

اردو زبان کے آغاز کا مسئلہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جدید علاقائی زبانوں پر تقریروں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس میں ۲۷ فروری ۱۹۶۲ء کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے "اردو زبان کے آغاز اور ارتقا" کے موضوع پر تقریر کی اردو زبان کے آغاز پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر نارنگ نے کہا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا پہلا باقاعدہ سابقہ گیارھویں صدی عیسوی میں پنجاب میں ہوا اور یہ تقریباً ڈیڑھ صدی تک جاری رہا۔ ہندوستان کی لسانیاتی تاریخ میں یہ زمانہ اب بھی ہر لحاظ سے اہم کا ہے۔ ڈیڑھ صدی کے طویل عرصے میں مقامی اپ بھرنش پر نو وارد زبان کے اثر سے یقیناً نئی ملی جلی زبان بننا شروع ہو گئی ہوگی۔ سرزمین پنجاب میں اختلاط کا یہ عمل زیادہ دیر جاری نہ رہا اور بارھویں صدی کے ربع آخر میں محمد غوری کے حملوں

کے بعد پایۂ تخت دہلی قرار پایا۔ اس طرح وہ ناپختہ زبان جو پنجابیت کا اثر لئے ہوئے تھی دہلی کی بولیوں سے متاثر ہونا شروع ہوئی۔ اردو زبان کا ارتقائی سفر سات صدیوں تک جاری رہا۔ اردو پنجابی سے نکلی ہے نہ ہریانی سے وہ نہ برج سے ماخوذ ہے اور نہ صرف کھڑی سے بلکہ اس نے ان سب بولیوں سے اثر قبول کیا ہے۔

دیوان غالب کے عرشی ایڈیشن کو ساہتیہ اکیڈمی کا انعام

ہندوستان کی تمام اہم زبانوں کی معیاری کتابوں کو ۱۹۶۱ء کا انعام دینے کا فیصلہ کرنے کے لئے ساہتیہ اکیڈمی کے انتظامی بورڈ کا ایک جلسہ ۸ مارچ کو نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ ساہتیہ اکیڈمی کے صدر شری جواہر لال نہرو نے جلسے کی صدارت کی۔ بورڈ نے اس سال ہندوستان کی تیرہ زبانوں کی کتابیں انعام کے لئے انتخاب کی ہیں۔ جن کو پانچ پانچ ہزار روپے کے انعام دیئے جائیں گے۔

اردو کی کتابوں میں امتیاز علی صاحب قریشی کے مرتبہ "دیوان غالب" کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ یہ دیوان غالب انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کیا ہے۔ انعام تقسیم کرنے کے لئے ۱۳ مارچ کو نئی دہلی میں ایک خصوصی تقریب ہوگی جس میں شری جواہر لال نہرو انعامات تقسیم کریں گے۔

دیوان غالب کے عرشی ایڈیشن سے پہلے انجمن ترقی اردو (ہند) کی دو اور مطبوعات کو ساہتیہ اکیڈمی کے انعامات مل چکے ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی تصنیف "قومی تہذیب کا مسئلہ" ہے اور دوسری کتاب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب کی تالیف میر تقی میر ہے۔

انجمن ترقی اردو کی شاخ دہلی

انجمن ترقی اردو ہند کی شاخ دہلی کی جانب سے ۱۰ فروری ۱۹۶۲ء کو مرزا غالب پر یوم غالب منایا گیا۔ رمضان اور الکشن کے ہنگامے کے باوجود ممبران انجمن کے علاوہ مقامی شاعروں، ادیبوں، اخبار نویسوں اور معزز شہریوں نے اس بزم میں شرکت کرکے مرزا غالب کو عقیدت پیش کیا۔ خواتین نے بھی کافی تعداد میں شرکت کی۔ صدارت کے فرائض ڈاکٹر تارا چند صاحب نے ادا کئے۔ پنڈت سندر لال صاحب صدر شاخ دہلی نے ڈاکٹر تارا چند صاحب کا خیر مقدم کرکے جلسے کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر تارا چند کے خطبۂ صدارت کے بعد گوپی ناتھ صاحب امن لکھنوی نے غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ غالب جیسی ہستیاں کسی ایک ملک ایک صوبے یا ایک زبان کی نہیں بلکہ تمام دنیا کی ملکیت ہوتی ہیں۔ رشید حسن خاں صاحب نے غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

سلام مچھلی شہری نے نظم "غالب" پیش کی جس کو بہت پسند کیا گیا۔ اس کے بعد غالب کی طرح میں روشن صدیقی، طالب دہلوی، محسن زیدی اور سمنت پرکاش نے غزلیں پڑھیں۔

آخر میں غالب کی دو غزلیں دہلی کے مشہور فن کار لبیقوں نے والہانہ انداز اور دلپذیر ترنم میں پیش کرکے حاضرین پر عالم وجد طاری کر دیا۔

بھنڈ میں شاندار مشاعرہ

سالانہ نمائش کے سلسلے میں باہتمام میونسپل بورڈ بھنڈ ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں مقامی و بیرونی شعراء نے حصہ لیا۔ مہمان شعراء میں ڈاکٹر شفا گوالیاری، ریاض بجے پوری، نیاض گوالیاری، حیدر گوالیاری، ڈاکٹر تائب بے تاب کانپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

مدراس میں ایک ادبی نشست

ہفتہ وار پیام جنوب مدراس کے زیر اہتمام جناب ولی تاج محمود کے اعزاز میں سلطان الشعراء پروفیسر مولانا سید عظمت اللہ صاحب سرمدی ایم اے کے دولت کدہ پر ۲۳ جنوری کو دن کے ۱۰ بجے ایک مخصوص نشست ترتیب دی گئی۔ حضرت سرمدی نے اس مخصوص بزم شعر کی صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ اس ادبی نشست میں علاوہ دیگر شعرا کے سروش مدراسی، کمال مدراسی، آثم کرنولی، فورس خیالی، حضرات اور ہمارے خصوصی حضرت ولی تاج نے شرکت کی۔ یہ پر لطف نشست حضرت آثم کرنولی کے ہدیۂ تشکر پر شام کے ۸ بجے اختتام کو پہنچی۔ (کمال مدراسی مدیر پیام جنوب مدراس)

پنجابی اکیڈمی میں نادر نسخہ

پتہ چلا ہے کہ دیوان واقف کا دستخط شدہ نسخہ پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور نے حاصل کیا ہے جو شاہ عالم ثانی کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے کاتب میر محمد خاں یوسف زئی ہیں اور یہ خوب صورت نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ حاشیہ پر درج شدہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خالصہ لائبریری میں بھی رہا ہے۔

چیک زبان میں غلام عباس کی کہانی کا ترجمہ

آنندی پر پہلا انعام

چیکوسلاواکیہ سے اطلاع ملی ہے کہ ۱۹۶۰ء میں جو کہانیاں چیک زبان میں شائع ہونے والے ترجموں میں پہلا انعام پاکستانی افسانہ نگار غلام عباس کی مشہور کہانی "آنندی" کے ترجمے کو ملا۔ "آنندی" کا یہ ترجمہ نصیر احمد زبیری نے چیک زبان میں کیا تھا جو چیکوسلاواکیہ میں اردو کے استاد ہیں۔

واہی

اشٹ گرہ

کبھی کبھی تو نحوست وہ کام کرتی ہے
کہ خود ہی دوڑ کے الجھی سلام کرتی ہے
ابھی جو اشٹ گرہ کا تھا شور و غل پھیلا
تمام ملک کے اندر مچا تھا واویلا
نجومیوں نے یہ جوتش کے تیر تھے مارے
کہ ٹل رہے ہیں فلک پر جو آٹھ سیارے
تو اس غریب زمیں پر زوال آئے گا
ہزار آفتیں آئیں گی، کال آئے گا
اب اس خبر سے دماغوں میں وہ خلل آیا
کہ مغز سب کے سروں سے نکل آیا
جہاں بھی جائیے ہر سو اسی کے چرچے تھے
تو صفحات سے مملو تمام پرچے تھے
گرہ کی کاٹ کی ترکیب بھی نکالی گئی
مگر نہ گردش سیارگاں پہ ٹالی گئی

قلوب اہل توہم جو ڈر سے گھبرائے
تو ان غریبوں کے اوپر سے پلٹ آئے
کہیں دو اہل دول نے تجوریاں کھولیں
مہاجنوں نے اناجوں کی بوریاں کھولیں
گرہ کی ساعتیں راحت نہیں پھر ان کے لئے
سیٹھوں کی [illegible] نہیں پھر ان کے لئے
نکل کے جانے لگی ان کے سامنے ڈالی
ہوئی نصیب مقدر سے فارغ البالی
ہون کے زور سے افلاک کو ہلایا گیا
تمام ملک کو گھی آگ میں جلایا گیا
ہون کی آگ نے دیں نحوستیں ساری
فروغ پانے لگے ڈالڈا کے بیوپاری
کہ اور فائدہ اس تہلکے نے پہنچایا
کہ روزگار کو جیسے کہ خوب چمکایا
جو سال بھر میں کماتا کوئی غریب ایجنٹ
وہ تین دن میں کما لایا خوش نصیب ایجنٹ
اسی طرح سے بچارے مسافروں کے لئے
سفر میں بھیڑ کے مارے مسافروں کے لئے
گرہ کی ساعتیں پیغام امن و راحت تھیں
سکون جسم تھیں زائل کن صعوبت تھیں
گھروں سے کوئی نکلتا نہ تھا سفر کے لئے
ہزار کام ہو چلتا نہ تھا سفر کے لئے
ابھی دنوں میں جو ہم اک مشاعرے میں گئے
تو بھیڑ میں بھی ملے فرسٹ کے سفر کے مزے
خدا سے اب یہ دعا ہے کہ ایزد غفار
پھر آئے سال میں جب بھی مشاعروں کی بہار
تو شاعروں پہ ترا فیض عام ہو جائے
یہی ستاروں کا گر جو نظام ہو جائے

شہاب سرمدی

سیکڑوں ویران آنکھیں ہر طرف
دیکھنا کیا چاہتی ہیں کیا نہیں
ہے بہت الجھا ہوا یہ سلسلہ
ڈھونڈنے پر بھی سرا ملتا نہیں

ساتھی کوئی ملنا ہے تو مل جائے گا
ایسے میں بھلا کس کا سہارا ڈھونڈیں
یہ وقت نہیں عاقبت اندیشی کا
طوفان سے ابھریں تو کنارہ ڈھونڈیں

ان کو دیکھے ہوئے مدت سی ہوئی جاتی ہے
اب طبیعت نہ بہلتی ہے نہ گھبراتی ہے
غم دوراں سے جو فرصت کبھی ہوتی ہے نصیب
دور سے دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

آئی آواز کہ ہاں ساز کی لے تیز کرو
لے کرو تیز مگر یوں کوئی بھی نہ گھٹے
الغرض ایک [illegible] ہے استعجالی کا
سُر اگر سُر ہے تو پھر اپنی جگہ سے نہ ہٹے

سمجھانے کسان آیا تو ہم اس کو سمجھیں گے
چلو دیہات میں دیکھیں وہ دکھیا اور ہی کچھ ہے
زمین نرم کی تہذیب کاغذ پر نہیں ملتی
قلم کی نوک کچھ ہے ہل کی مٹھیا اور ہی کچھ ہے

غزل

مجید میدس

اب نہیں کہ جب بھی شکوے گلے کئے گئے
کچھ شوق تھا کچھ درد کے آ قافلے گئے
مجھے یقیں کسی طرح دل کو نہ چین آئے گا
ہر شخص اجنبی وہ بس آپ سے ہم مل گئے
شمیم سایہ نہ جھکا قابل بھی پائے ناز پر
وہ اللہ کو جو ہم کر سجدہ کر آ بیٹھے گئے

رئیس اجمیری

جہاں ذات اب یہیں ہی نغمہ خواں ٹھہرے
وہ لوگ ہمارے زمانے میں جاوداں ٹھہرے
کہ نہیں جو تغافل شعار ہے دنیا
میرے رفیق جب سے بدگماں ٹھہرے
وہ لوگ جن پہ لگائی تھی مہر پابندی
وہی مزاج مشیت کے رازداں ٹھہرے

یحییٰ شفائی (شیخوپوری)

اگرچہ جنوں سے بڑھ گئی دیوانہ پر ساقی
اٹھا دیں گے یہ تشنہ مے بسا در انجمن ساقی
یہ میکش ہیں نہ میخانے نہ شمع ہے نہ پروانے
بدلتا جا رہا ہے کیوں یہ رنگ انجمن ساقی
خزاں نے چھین لی کچھ مسکراہٹ غنچہ و گل کی
ہمیں راتوں نے لوٹا چمن کا بانکپن ساقی

تمنا یوسفی

ترا پازیب کی جھنکار ہے اکثر مجھ کو
رقص آزادیٔ انساں کا خیال آیا ہے
چہرہ خلقیں نظر آزردہ پریشاں گیسو
تم کو کس خواب پریشاں کا خیال آیا ہے
جس کے بازار میں نیلام ہوئے دیدہ و دل
پھر اسی شہر نگاراں کا خیال آیا ہے

رئیس رامپوری

امید کرم غم گسار آج بھی ہے
مجھے آپ کا اعتبار آج بھی ہے
سکوں کی تمنا مسرت کی خواہش
مزاج محبت پہ بار آج بھی ہے
نہیں اس طرح سے گزاری تھی ہم نے
کہ زندہ دلوں میں شمار آج بھی ہے

حیات لکھنوی

شکل راحت نظر نہیں آتی
غم سے کب آنکھ بھر نہیں آتی
عرصۂ حشر طے ہوا لیکن
آپ کی رہ گزر نہیں آتی
کتنے ہی انقلاب آئے حیاتؔ
زندگی راہ پر نہیں آتی

جمیل گلشن آبادی

خزاں میں چھوڑ چلے تھے چمن کو اہل چمن
بہار آئی تو کہتے ہیں حق ہمارا ہے
نہ دیکھو ہم کو حقارت سے باغباں سن لے
جو تیرا حق ہے چمن پر وہی ہمارا ہے
ہمیں سے آبرو قائم ہے گلستاں کی جمیلؔ
ہمیں نے خون سے اپنے اسے سنوارا ہے

شوق اثری

افسانۂ غم کا کوئی انداز نہیں ہے
انجام نہیں ہے کبھی آغاز نہیں ہے
اب میری طرف وہ نگہ ناز نہیں ہے
فریاد بہ اذن لب اعجاز نہیں ہے
پھر بھی ہمیں اے شوق ہیں دنیائے ادب
نازاں ہوں اسی پر کہ مجھے ناز نہیں ہے

نثار احمد فاروقی

کچھ غالب کے بارے میں

(مختصرات)

(۱)

غالب کی رباعی:

"مطبع محمدی محمد مرزا خاں واقع دہلی" کے ایک چھوٹا سا رسالہ "عیدی نامہ" طبع ہوا تھا، جس کے سرورق پر لکھا ہے:

"... ساتھ مدد عنایت بے غایت حضرت واہب
العطیات کے یہ رسالہ موسومہ بہ عیدی نامہ حسب
فرمایش مولانا محمد قمر الدین صاحب، تاجر کتب دہلی
کے مطبع محمدی محمد مرزا خاں واقع دہلی باہتمام عبد الرزاق
طبع شد"

اس کے صفحات کی تعداد ۲۴ ہے ابتدا یہ ہے:

واکر کے ثنائے حمد باری کہوں پھر نعت باو بگساری

آخر میں تاریخ طبع زادے چند المتخلص بہ عاصی مندرج ہے، آخر میں "مطبع محمدی محمد مرزا خاں واقع دہلی کو چہ چیلہ میں چھپا (?)" لکھا ہوا ہے۔ اس مختصر رسالے میں بچوں کے لئے عیدیاں جمع کر دی ہیں۔ ان میں اردو اور فارسی کے اشعار، قطعات اور رباعیات ہیں۔ اس کے جامع کا نام عباس معلوم ہوتا ہے۔ جامع نے سبب تالیف کتاب بھی نظم میں لکھا ہے:

سب ترتیب تحفہ کہ سراسر	ہے کے بعد اے عباس احقر
کہ دی ہائے دست دوز بیٹھیں	کیا کم دو دن سے کتنا مجموعہ
مشرق گل شگفتہ بوستاں میں	ہر کہتہ ہے متفرق جہاں میں کہا
تو باغ دہر میں گلچیں ہوا تو	جواں کا ایک گلدستہ بنا ہے

جامع بہت ہی معمولی مبتدی قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس رسالہ میں جو شعر رائس کے طبع زاد ہیں ان میں بعض تو صحت اعتبار سے بھی محتنع ہیں بعض اوزان درست کے علاوہ بھی آزاد ہیں، بہر حال جامع نے بہت سے اساتذہ فارسی و اردو کے وہ اشعار جو تہوار وں کی مناسبت سے پیش کئے تھے جمع کئے ہیں اور ان کو بغیر کسی نظم و ترتیب کے جمع کر دیا ہے۔

تو باغ دہر میں تو ہمسر نہ پایا	یہ تحفہ جب کہ میرے ہاتھ آیا
دکھایا لالہ سحر میں کو جانے	چمن کا ایک گلدستہ بنا کے
ہوئے بانی مبانی اس ہنر کے لکھا	فزوں کر کے رہ گلدستہ ہنر کے
بہر عید جہاں میں تو عیاں کر لکھا	میاں عباس یہ تحفہ ہے نادر

جو اس میں رمضان، عید الفطر، عید الاضحی، آخری چہار شنبہ، شب برات، نوروز، دسہرہ، سلونو، دیوالی، بسنت، ہولی پر قطعات ہیں جن میں بعض جامع رسالہ کے نانیہ کا ذکر بھی ہے۔ صفحہ ۱۹ پر قطعات کے بعد "اشعار متفرقہ" کے زیر عنوان غالب کے قطعات و رباعیات نقل ہوئی ہیں مثلاً: سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں۔ الخ

ایام جوانی رہے ساغر کش حال	پاس ہے از اہتمام بزم عید اطفال
اے عمر گذشتہ یک قدم استقبال	آپہنچے ہیں تا سواد اقلیم عدم

یہ رباعی نسخہ عرشی میں بھوپال والے نسخہ کے حوالے سے نقل ہوئی ہے۔ تیسرا قطعہ وہ ہے جس کا آخری مصرع ہے:

روزہ اگر نہ کھاوے تو ناچار کیا کرے

چوتھا قطعہ جس کا پہلا شعر ہے:

رکھ دیں چمن میں بھر کے مے مشک بو کی ناند	ہے چار شنبہ آخر ماہ صفر چلو

یہ بھی دیوان غالب نسخہ عرشی میں (ص ۱۲۸) موجود ہے۔

پانچویں رباعی یہ ہے: "آتش بازی ہے جیسے شغل اطفال" نسخہ عرشی میں (ص ۲۵۳) پر ملتی ہے۔

البتہ چھٹی رباعی دیوان غالب نسخہ عرشی میں نہیں ہے۔ اس کے عنوان میں لکھا ہے: "رباعیات در مدح تعلق نوروز"۔

شاہا تجھے با دولت و بخت فیروز
فرخ ہو سدا جہاں میں جشن نوروز
ہو دے شرف اندوز ترے طالع سے
ہر سال حمل میں مہر عالم افروز

اس کے بعد اسی مجموعے میں یہ دو قطعات بھی ہیں جو اگرچہ کلام غالب کے ذیل میں نقل ہوئے ہیں اور ان کے عنوان میں "مرزا نوشہ" لکھا ہوا ہے۔ مگر میرا وجدان کہتا ہے کہ یہ مرزا غالب کے طبع زاد نہیں ہو سکتے۔

عیش سے وابستہ ہے غم سے ہر اک آزاد ہے	عید قرباں ہے دل اہل زمانہ شاد ہے
ہر طرف کی جشن ہے ہر سو مبارکباد ہے	عشرت و عیش و طرب کے ہیں جا بجا

دوسرا قطعہ بسنت سے متعلق ہے:

خوب گلدستہ خوشی لائی	گلشن دہر میں بسنت آئی
دیدۂ گلرخاں تماشائی	گوش گل سوئے دیدۂ بلبل

اس کا سال انطباعت چند عاصی نے خدا جانے کون سی صنعت سے برآمد کیا ہے۔ قطعہ تاریخ ساقط الوزن ہے اور اس کا آخری شعر یہ ہے:

سبحان اللہ ہو سنہ تاریخ تازہ گل	اس عرصہ میں پکارا ہاتف غیبی حضرت

لاکھ سر مارا مگر کوئی تاریخ برآمد نہ ہوئی۔ میرا قیاس یہ ہے کہ رسالہ مذکور غالب کی زندگی میں چھپا ہے اور نوروز والی رباعی جو اس پر نقل ہوئی غالب ہی کی ہے جو کسی دوسرے مجموعہ میں نہیں ملتی۔

(۲)

بسمل میرٹھی:

تلامذہ غالب مؤلفہ جناب مالک رام میں منشی غلام بسمل اللہ میرٹھی (شاگرد غالب) کا ترجمہ شامل ہے اور اس میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ وہ "حضرت شاہ عبد الرحمن گنج مراد آبادی سے بیعت تھے۔" مجھے ضیاء الدین علوی نقشبندی کا لکھا ہوا ایک رسالہ (مطبوعہ ۱۳۱۲ھ) دستیاب ہوا ہے جس میں بسمل کا بھی تذکرہ ملتا ہے، یہ ناقص الاول ہے اس لئے اس کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بسمل حضرت شاہ عبد الرحمن شاہجہانپوری سے بیعت تھے۔ جناب مالک رام نے سہواً قوسین میں "گنج" لکھ دیا ہے۔ گنج مراد آباد ایک قصبہ

ضلع مراد آباد سے مختلف ہے اور اس سے حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کا تعلق تھا۔ اس رسالہ سے یہ بھی علم ہوا کہ منشی غلام بسمل اللہ میرٹھی نے حضرت شاہ عبدالرحمٰن صاحب کے کچھ حالات قلم بند کئے تھے مگر آپ نے طلب فرماکر سب کو چاک کر دیا۔" ان کے حالات شاہ محمد مظہر مجددی کی کتاب "زبدۃ الکاملین" میں بھی موجود ہیں۔ شاہ عبدالرحمٰن شاہجہانپوری نے دہلی جاکر حضرت شاہ غلام علی نقشبندی سے توجہ حاصل کی تھی اور علم باطن کی تحصیل کے لئے چھ سال تک وہاں مقیم رہے تھے۔ آخر وقت میں سب سے پہلے مولوی غلام بسمل اللہ صاحب کو آپ نے یہ وصیت فرمائی کہ تم خود بھی یہ سمجھ لو اور دیگر احباب طریقہ کو بھی اس سے آگاہ کر دینا کہ کوئی فعل میرا اگر سنت رسول اللہ صلعم کے خلاف دیکھا ہو تو اس کی ہرگز پیروی نہ کرنا۔ غایت مافی الباب اپنے حسن اخلاق سے میری کسی معذوری پر محمول کرنا ورنہ عاقبت میں میری ماخوذی کا باعث ہوگا۔"

منشی غلام بسمل اللہ کے ایک پوتے بہت ہی کم سواد ہیں اور حکومت ہند کے کسی محکمہ میں ملازم۔ ایک بار مجھے ریل میں ملے تھے اور انھوں نے بتایا تھا کہ منشی غلام بسمل اللہ صاحب کا غیر مطبوعہ کلام اور کاغذات ان کے پاس تھے۔ مگر ایک صاحب ان سے مضمون لکھنے کے بہانے لے گئے۔ اُن صاحب کا نام اور پتا بھی بتایا تھا جو میں بھول گیا۔

(۳)

جواہر سنگھ جوہر

تلامذۂ غالب میں منشی جواہر سنگھ جوہر کا حال بھی شامل ہے اور لکھا ہے کہ "جوہر صرف فارسی کہتے تھے۔" اردو سے شغل سے اُن کی ایک فارسی غزل کے چند اشعار بھی نقل کئے ہیں (ص ۹۷) جناب مالک رام نے اس کتاب کے ص ۲۸۴ پر لکھا ہے "منشی فدا علی عیش نے ۱۸۶۵ء میں لکھنؤ سے دو جلدوں میں واسوختوں کا ایک مجموعہ "شعلۂ جوالہ" کے نام سے شائع کیا تھا۔" اسی مجموعہ میں ایک واسوخت جواہر سنگھ جوہر کا بھی ہے۔ اس مجموعہ واسوخت کا اشتہار دیوان غالب طبع ۱۸۶۳ء کے سرورق پر بھی چھپا تھا اور اس میں بھی جوہر کے واسوخت کا ذکر آیا ہے۔ یہ واسوخت اردو میں ہے۔ میں نے یہ مجموعہ دیکھا ہے مگر اس کا نام "شعلۂ جوالہ" دیکھنا یاد نہیں۔ یہ پہلے الگ الگ حصوں میں چھاپا گیا تھا۔ بعد میں سب کو ملا کر ایک جلد بنایا گیا۔ ممکن ہے مجموعہ کی شکل میں مرتب کرنے کے بعد اس کا نام "شعلۂ جوالہ" رکھ دیا گیا ہو۔ میں نے جو مجموعہ دیکھا ہے اس میں ہر شاعر کا واسوخت الگ حصہ کی شکل میں چھپا پایا گیا تھا۔

(۴)

خورشید

شاہ خورشید احمد خورشید دہلوی کا ترجمہ بھی تلامذۂ غالب میں موجود ہے مگر خورشید کے بارے میں ایک کتاب "ہدیۂ احمدیہ" مولفہ شیخ احمد علی (مطبع انتظامی کانپور) سے چند باتوں کا علم ہوتا ہے جو تلامذہ میں شامل نہیں ہیں۔

شاہ خورشید احمد بن میاں شکور احمد بن شیخ محمد شریف مجددی شاہ رؤف احمد کے چچازاد بھائی تھے۔ بعد خرابی دہلی سکونت کابل اختیار کرلی تھی۔ اشعار فارسی میں مستفیدان غالب سے تھے۔ اور ریختہ میں تلامذۂ مومن خاں سے تھے۔ سنہ ۱۲۸۴ ہجری میں مکہ معظمہ میں رحلت کی تین لڑکے اور تین لڑکیاں چھوڑیں۔"

(۵)

فخرالدین سخن

فخرالدین سخن دہلوی شاگرد غالب کے بارے میں مؤلف تلامذۂ غالب کا بیان ہے کہ انھوں نے سنہ ۱۳۱۹ھ میں کلکتہ میں انتقال کیا۔ معاصر (حصہ ۲) میں ایک مضمون جناب فصیح الدین بلخی کا بعنوان "پٹنہ میں شعرا کے مزارات" شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ: "سخن کا مزار حضرت عشق کے مزار سے پورب ساحل کے قریب پختہ بنا ہوا ہے۔ سیلاب میں اس کا کچھ حصہ منہدم ہو گیا ہے۔ اُتر پورب کونے پر آخری پختہ قبر یہی ہے اس لئے شناخت میں دشواری نہیں۔" (معاصر ۲/۸۱-۸۲) - یہ ممکن ہے کہ سخن نے کلکتہ میں انتقال کیا ہو لیکن وہ پٹنہ میں دفن ہیں۔

(۶)

دیوان شاداں

حسین علی خاں شاداں خلف میرزا زین العابدین عارف شاگرد غالب کے ترجمہ میں جناب مالک رام نے تحریر فرمایا ہے کہ "کلام مرتب نہیں ہوا۔" اُن کا قلمی دیوان اردو کتب خانہ رامپور میں محفوظ ہے۔ عرصہ ہوا میں نے اس سے یادداشت قلم بند کی تھی مگر وہ اس وقت نہیں ملی۔

(۷)

نقشبند خاں

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (شاگرد مومن و غالب) کے بارے میں جناب مالک رام نے تحریر فرمایا ہے:

"شیفتہ نے ...... دو نکاح کئے۔ پہلی بیگم سے صرف ایک صاحبزادہ جناب محمد علی خاں رنگی ہوئے ...... جناب افضل بیگم دوسری بیوی سے دو لڑکے نقشبند خاں اور نواب محمد اسحاق خاں اور دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ یہ نقشبند خاں ہی تھے جن کی تعلیم کے لئے حالی مقرر ہوئے تھے۔ یہ شعر بھی کہتے تھے مہجور تخلص تھا۔ ان کا انتقال تینتیس برس کی عمر میں ۵ نومبر ۱۸۷۷ء (۲۸ شوال ۱۲۹۴ھ) کو ہوا۔ حالی نے تاریخ کہی: "وصلوہ من اسالدین شفقۃ (قرآن شریف سورہ...)" (تلامذۂ غالب ص ۱۸۵)

اخبار اکمل الاخبار دہلی مورخہ ۸ نومبر ۱۸۷۷ء روز چہارشنبہ (جلد ۲ شمارہ ۲۱) کی ایک خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ نقشبند خاں نے ۷ نومبر (یکشنبہ) کو بعمر ۳۳ سال انتقال کیا تھا۔ خبر یہ ہے:

"افسوس ہزار افسوس کہ یکشنبہ کو نواب محمد نقشبند خاں ولد نواب مصطفیٰ خاں مرحوم المتخلص بہ شیفتہ کے بیٹے صاحبزادے عین عالم شباب میں یعنی ۳۳ برس کی عمر میں راہی عالم قدس ہوئے۔"

ڈاکٹر گیان چند

ہندی انگریزی الفاظ اور اردو املا

(گزشتہ سے پیوستہ)

سنسکرت میں ऋ کو حرفِ علت مانا گیا ہے جس کی وجہ سے اس کے پہلے اور بعد میں کوئی حرفِ علت نہیں ہوتا کسی کو معلوم نہیں کہ اس آواز کو حرفِ علت کے طور پر کیونکر ادا کیا جاتا تھا۔ اب شمالی ہند میں اس کا تلفظ رائے مکسور اور مراٹھی میں رائے مضموم ہوتا ہے چنانچہ ہندی بولنے والے رِشی، سنسکرت بولتے ہیں اور مراٹھے رُشی سنسکرت کہتے ہیں۔ غلام رسول صاحب نے اس کو رائے ممدودہ کہا اور اس کے لئے علامت (ـٖر) وضع کی۔ ترقی اردو بورڈ نے اور بڑھا کر رِ تجویز کیا۔ دونوں غیر ضروری ہیں۔ ہندی میں اس کا تلفظ رائے مکسور کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے لئے کسی نئی علامت کی ضرورت نہیں۔ یہ جب لفظ کے درمیان آتی ہے تو اس کے پہلے کوئی حرفِ علت نہیں ہوتا حرفِ صحیح ہوتا ہے۔ یہ حرفِ صحیح ساکن ہوتا ہے۔ ذیل میں ऋ اور اس کے ماقبل کی آواز کے مجوزہ املا درج کئے جاتے ہیں

راقم الحروف	ترقی اردو بورڈ	غلام رسول صاحب
رِشی	رِشی	رٖشی
کرِشن	کرِشن	کرشن

ترقی اردو بورڈ نے Trishna کو بھی تِر سے لکھا ہے۔ اس میں بھی ت ساکن اور رائے مکسور ہے۔ غلام رسول صاحب نے پیاز، دھیان، جوالا، سواگت، سکول، برج وغیرہ کے پہلے حرف کو نیم آواز سمجھ کر ان پر نیمہ استعمال کیا ہے لیکن ان سب میں پہلا حرف ساکن اور دوسرا حرف متحرک ہے۔ اس طرح نیمہ (ـ) اور رائے ممدودہ (ـٖر) دونوں سراسر حشو و زوائد ہیں۔

ہندی انوسوار کو ترقی اردو بورڈ م یا ن پر ایک چھوٹے سے دائرے (سمْواد، نبْش) سے ظاہر کرنا چاہتا ہے اور غلام رسول صاحب اسے محض م ساکن یا ن ساکن قرار دے کر جزم کی علامت (سمْواد، نبْش) کافی سمجھتے ہیں۔ م کی حد تک غلام رسول صاحب صحیح ہیں لیکن ن کے معاملے میں اسے ہر جگہ نون ساکن کے مساوی قرار دینا کافی نہیں۔ اردو میں ن کی مختلف آوازوں میں بڑے نازک اختلافات پائے جاتے ہیں ان میں سے چند ملاحظہ ہوں۔

ا　سنبھالنا ۔ گنوارا ۔ کنواں

ب　سنگھاڑا ۔ ڈھنڈھورا ۔ سنگھاسنا

ج　زندہ ۔ گندا ۔ گُندا

ان میں ا کے الفاظ چند، بندو [ن] کی مثال ہیں۔ ج کے الفاظ کو ہم محض ن ساکن سے ظاہر کرتے ہیں لیکن ب کی ذیل کے الفاظ کا 'ن' حالانکہ ساکن ہے لیکن اس کے لئے اگر محض جزم استعمال کریں تو ان الفاظ کو یوں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

سِن گھاڑا ۔ ڈھن ڈھورا ۔ سِن گھاسنا

اس طرح کے اعلانِ نون سے بچنے کے لئے ہمیں ن ساکن سے علیحدہ کوئی علامت وضع کرنی ہوگی۔ علامت کیا ہو اس کی زیادہ اہمیت نہیں۔ میں دائرہ کی بجائے نیم دائرہ یعنی ہلال یا نیمہ کو ترجیح دوں گا۔ اب میری مجوزہ علامات ملاحظہ ہوں:

ا۔ پانچ ۔ گنوار، ب چاند۔ ڈھنڈھورا ۔ ج زندہ ۔ گندہ

ہندی وسرگ (:) ایسی نادر آواز ہے جو اب گنتی کے چند الفاظ میں پائی جاتی ہے۔ حسن صاحب اردو میں ہندی علامت رائج کرنا چاہتے ہیں مثلاً (پُنہ:) ترقی اردو بورڈ نے اس کے اظہار کے لئے ہ پر ایک دائرہ بنانے کی ہدایت کی ہے [پنہْ]۔ غلام رسول صاحب وسرگ کو محض ہائے مختفی سے ظاہر کرنا چاہتے ہیں مثلاً [پنہ] لیکن اس طرح اسے شاید پُنا پڑھا جائے گا۔ وسرگ کی آواز کی دو خصوصیات ہیں۔ اول تو اس میں خفیف سی ہ کی آواز ہوتی ہے۔ دوسرے اس میں حرفِ علت اے کا رجحان ہوتا ہے۔ چونکہ اس میں ہ کی آواز خفیف ہے اس لئے اس کے لئے ہائے ملفوظی کی بجائے ہائے مختفی ہی مناسب ہے لیکن اے کا رنگ دینے کے لئے اس سے پہلے حرف پر خفیف اے یعنی زیر امالہ دار کا نشان لگانا ہوگا۔ اس طرح [پُنہ]۔ واضح ہو کہ یہ حرفِ علت اکثر ہ سے پہلے ہی آتا ہے۔

اب لیجئے چند انگریزی حروفِ علت کا تلفظ

راقم الحروف	ترقی اردو بورڈ	غلام رسول صاحب	انگریزی
لارڈ	لورڈ	لارڈ	lord
کال	کال	کال	call
مَین	مَین	میان	man
پَین	پین	پین	pen
ڈوَر	ڈوَر	ڈور	dore

انگریزی لفظ لارڈ، کانگریس وغیرہ کا حرفِ علت آ اور او کے درمیان ہے۔ یہ آ سے نزدیک تر ہے اس لئے اردو میں ان الفاظ کو محض الف سے لکھا اور بول دیا جاتا ہے۔ اسی لئے ہم اس آواز کے لئے الف کی علامت کو بنیاد بنائیں گے واؤ کو نہیں۔ اس کے بعد اس الف کو مائل بہ واؤ کرنے کے لئے اس سے پہلے حرف ل پر پیش لگا دیں اور جس طرح واو لین میں ماقبل فتحہ لگا کر واؤ کی آواز کو آ کی طرف چھوڑ دیا تھا اسی طرح الف کے ماقبل ضمہ لگا کر آ کی آواز کو او کی طرف موڑ دیں گے۔ اس طرح یہ علامت نہایت برجستہ ہو جاتی ہے۔ میرے نزدیک call، shock وغیرہ کو بھی 'لارڈ' کی طرح لکھنا چاہئے کیونکہ لارڈ اور کال میں حرفِ علت کا فرق نہ ہونے کے برابر ہے۔ Cat اور man کے بارے میں غلام رسول صاحب لکھتے ہیں:

"ان میں ے کا تلفظ الف کے ساتھ ی کی آدھی آواز کو ظاہر کرتا ہے اس لئے ان کو اردو میں یائے مخلوط کی علامت سے 'میاں' لکھنا چاہیے۔" اگر غلام رسول صاحب اس حرف علت کو diphthong مان کر پہلے الف اور اس کے بعد ی لکھتے تب بات کچھ کچھ سمجھ میں آتی لیکن یہ کیاٹ اور میاں تو میرے ہوش اڑائے دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ cat کا تلفظ سیدھی سادی یائے لین سے ہے۔ اسی طرح pen میں بھی اے کی آواز ہے گو cat کے مقابلے میں قدرے خفیف عام طور سے ہمارے تلفظ میں کیٹ اور مین کے حرف علت میں کوئی فرق نہیں اس لئے اردو تحریر میں بھی خواہ مخواہ موشگافی کی ضرورت نہیں۔ اور اگر فرق کرنا ہی ہے تو pen کو خفیف اَے سے لکھئے جس کے لئے میں پیشتر علامت تجویز کر چکا ہوں (پَین) معلوم نہیں اردو بورڈ نے اس کو ऍ کا مساوی کیوں قرار دیا۔ dove میں آخری واؤ ساکن حرف صحیح ہے میں اس پر الٹے جزم کی وہی علامت استعمال کروں گا جو اوتار، کیشو وغیرہ کے سلسلے میں طے کی تھی۔

اس مضمون میں میں نے مروجہ اعراب کے علاوہ جو علامات تجویز کی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱	خفیف اِے	سہرا
۲	خفیف اَے	کہنا
۳	خفیف اُو	سُگھرام
۴	درمیانی یائے معروف	مچھیل
۵	آخری اِ (ि)	رگھوپتی - رشی
۶	آخری اُ (ु)	اربند - گرو
۷	call و lord	کال - لارڈ
۸	چندر بندو یعنی غنائی حرف علت	پانچ - گنوار
۹	انوسوار	ہنس - ڈھنڈھورا
۱۰	ساکن واؤ بطور حرف صحیح بطور مثال dove	اوتار - ڈوو
۱۱	ऋ	رِ
۱۲	کرشن - پریم - سکول	کرشن - پریم - سکول

تو تجویز علامات میں کوئی قطعیت نہیں۔ ان کے پیچھے جو اصول پوشیدہ ہیں انھیں تسلیم کرکے اگر نشانات میں کوئی مناسب تبدیلی کر دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

بقیہ: ہندو خواتین اور اردو شاعری

اس طرح بریلی اترپردیش کی سیاسی کارکن اور سوشل ورکر کملا چودھری کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا۔ موصوف ہندی کی ادیب ہیں اور ان دنوں ہندی خیالات کو اردو کا جامہ پہنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔

خواتین کے لئے خصوصی طور پر شائع ہونے والے رسالوں میں جن بہنوں کا کلام شائع ہوتا ہے ان میں ودیاوتی تسنیم، کرشنا کماری راحت، پربھا لکھنوی اور رتن صاحبہ بنارسی قابل ذکر ہیں۔

ان کی آنکھوں کا کیا قصور تسنیم — دل کو خانہ خراب ہونا تھا

بجھ گئی شمع ستارے بھی بجھے جاتے ہیں — ایک میں ہوں جو بدستور جلے جاتا ہوں

(راحت)

حیدرآباد دکن کے مختصر قیام اور یہاں کے ادبی ماحول نے رتن دیوی بنارسی کے ذوق شاعری کو بڑی حد تک نکھارا ہے اور ان دنوں وہ خون کلیجے سے گیسوئے اردو کو سنوار رہی ہیں۔ آپ کا یہ شعر یقیناً پسند آئے گا:

وعدہ تو کیا تم نے اور نہ آئے وعدے پر — جب تمہیں نہ آنا تھا کیوں آئے خیالوں میں

محترمہ تارا دیوی ماتھر زینت اور الہ آباد کی عندلیب سخن راج کماری سرور نہ صرف صاحب دیوان خواتین ہیں بلکہ ان دونوں کی شہرت دور دور تک پھیل چکی ہے اور اکثر دور دراز مقامات تک مشاعروں کی صدارت بھی کرتی ہیں۔ دونوں ہی پختہ مشق ہیں۔ کلام میں روانی و برجستگی پائی جاتی ہے اور نزاکت خیال و لطافت بیان سے کلام کی خوبی دوبالا ہو گئی ہے۔ زینت صاحبہ کا پہلا دیوان 'کلام زینت' دوسرا 'بہار زینت' کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ کچھ شعر ملاحظہ فرمائیے:

آپ کا اب حشر زینت دیکھئے ہوتا ہے کیا — کوشش پرواز تو بے بال و پر کچھ بھی نہیں

حاصل ہجر و وصال نہ کچھ عاقبت ہی — دونوں جہان سے ہم تو ہیں کے بس میں نہ تھے

محترمہ راج کماری بسریا سرور صاحبہ کا دیوان حضرت فراق کے مقدمے کے ساتھ 'حریم ناز' کے نام سے عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے ان کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے:

یہ کاکل بھی سرگوشیاں کر رہا ہے — ابھی کس لئے سر چڑھایا گیا ہے

آنکھیں رکھتا ہے تو پہچان بھی پیدا کرلے — تو جسے دیر سمجھتا ہے وہ کعبہ ہوگا

اردو ہماری زبان کے لئے سرور صاحبہ کی عبارت بھی دیکھئے:

دل میں ہمارے پنہاں ہے راز اردو — ہم سے قضا نہ ہوگی ہرگز نماز اردو

ہیں وجد میں فضائیں رقصاں ہیں ہر ترانہ — سرور نے کس ادا سے چھیڑا ہے ساز اردو

اردو زبان کی آبیاری کرنے والوں میں دو نوجوان لڑکیوں سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ شملہ کی کرشنا گپتا شبنم اور ضلع اناؤ کی کشوری چندر کنور چپل۔ اول الذکر ریڈیو شملہ سے منسلک ہیں اور چندر کنور چپل ابھی فارغ التحصیل نہیں۔ ان کے اشعار شرح کے محتاج نہیں۔

غم کی منزل بھی ہے حسین منزل — اس میں ہر موج کنارہ ہے

اب جو دنیا ہے مہرباں ہم پر — اس میں کچھ آپ کا اشارہ ہے

اس مختصر انتخاب کے بعد قدردان فن اصلی جواہر کلام کا اندازہ خود کر لیں کیونکہ میں تو انھیں کا سودائی ہوں:

"کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں"

مراسلہ

اردو سیاست کے گھن میں

اردو زبان کے بارے میں کانگریس نے بارہا اپنے کھلے اجلاسوں میں ایسی تجاویز پاس کی ہیں جس سے اس کی ہندوستان گیر حیثیت اور ثقافتی اہمیت شک و شبہ سے بالاتر ہوگئی۔ اس کے علاوہ صدہا ایسی یقین دہانیاں بھی ملتی ہیں جن میں قدم قدم پر اردو زبان کی ہندوستان گیر اہمیت اور افادیت سے اعتراف ہی نہیں کیا گیا ہے بلکہ ہر ہر موقع پر اعداد و شمار پیش کرکے یہ یقین دلایا گیا ہے کہ کانگریس کی پالیسی اردو کے سلسلے میں منصفانہ ہی نہیں بلکہ فراخ دلانہ ہے۔

۱۹۳۵ء کے "انڈیا ایکٹ" نافذ ہونے سے پہلے ہی اردو زبان بڑی حد تک سیاسی تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہو چلی تھی لیکن ۱۹۳۷ء میں جب غیر منقسم ہندوستان کے کئی صوبوں پر کانگریسی وزارتیں برسر اقتدار آئیں تو تدریجی طور پر کانگریس کے فراخ دلانہ رویہ کا دائرہ محدود ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ تقسیم ہند کے فوراً بعد ہی ۱۹۴۷ء کے آخر میں یو-پی کی کانگریس وزارت نے ہندی کو سرکاری زبان قرار دے کر عملی طور پر اردو کو ختم کرنا شروع کر دیا۔ گاندھی جی نے شدید مگر لاحاصل احتجاج بھی کیا۔ اور پھر وہ زمانہ آگیا کہ کانگریس کے بعض ذمہ دار لوگوں نے اردو زبان کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔

یہ صحیح ہے کہ آج کی سیاسی لغت میں "یقین دہانیاں اور وعدے" لایعنی اور بے جان الفاظ ہیں لیکن آئندہ آنے والی نسلیں جب اس دور کی لسانی تاریخ کا جائزہ لیں گی تو سیاسی پارٹیوں کے ان اعلانات اور صوبائی حکومتوں کی ان یقین دہانیوں کو نظر انداز نہ کر سکیں گی۔ بات بہت پرانی نہیں ہے۔ صرف بیس بائیس سال پیچھے مڑ کر دیکھئے تو پچھلی کانگریس وزارتوں کے دور میں آپ کو آل انڈیا کانگریس کے دستور کی دفعہ ۴ کے بموجب ترتیب دیا ہوا ایک لسانی نقشہ ملے گا جس میں باوجود شدید تنگ نظری کے "اردو" کے وجود سے انکار نہیں کیا گیا ہے۔ یہ نقشہ جو ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے ۱۹۳۸ء کے کانگریسی سیشن میں پیش ہو کر منظور ہوا تھا:

مقام	زبان	مقام	زبان	مقام	زبان	کیفیت
اجمیر مارواڑ	اردو	آندھرا	تیلگو	آسام	آسامی	آندھرا آسام میں ۲۰ فیصدی لوگ آسامی بولتے ہیں
بہار	اردو	بنگال	بنگالی	برار	مرہٹی	بنگال و برار میں بھی تقریباً ہر شخص اردو بولتا ہے۔
بمبئی	مرہٹی گجراتی	برما	برمی	ناگپور	مرہٹی	ان صوبوں میں ۸۰ فیصدی اردو بولتے ہیں۔
دہلی	اردو	گجرات	گجراتی	کرناٹک	کناری	گجرات و کرناٹک میں ۵۰ فیصدی اردو جانتے ہیں۔
کیرالا	ملیالم	صوبہ متوسط	اردو	مہاراشٹر	مرہٹی	یہاں ۴۰ فیصدی اردو جانتے ہیں۔
سرحد	اردو	پنجاب	اردو	سندھ	سندھی	سندھ میں ۹۵ فیصدی اردو بولتے ہیں۔
تامل ناڈ	تامل	یو-پی	اردو	اتکل	اڑیا	تامل ناڈو و اتکل میں پچاس فیصدی اردو جانتے ہیں۔

(ماہنامہ کلیم دہلی بابتہ ماہ جون ۱۹۳۸ء)

اس نقشہ میں اگرچہ "کشمیر" اور دوسری دیسی ریاستیں شامل نہیں ہیں اور حیدرآباد دکن کو آندھرا کا روپ دے کر اس کی لسانی حیثیت بدلنے کی کوشش کی گئی ہے، پھر بھی اس نقشہ میں موجودہ سرکاری زبان "ہندی" کا رنگ بھرا نہیں جا سکا اور شاید یہی قانونی و آئینی نکتہ ایسا ہے جس نے سمپورنانند جی کو یہ کہنے پر مجبور کیا ہے کہ "اردو زبان" "ہندی کا ایک اسلوب" ہے۔ "لسانی حد بندی" کے بعد اگرچہ سیاسی اور لسانی حقائق کو خلط ملط کرکے ہندی زبان کی سرکاری اہمیت کو کافی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر اعداد و شمار کا گورکھ دھندہ اب بھی یہ ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے کہ ہندی آج کے ہندوستان کی اکثریت کی زبان ہے ۔۔۔ چکرورتی راجگوپال آچاریہ کے الفاظ میں ہندی صرف چالیس پینتالیس فی صدی آبادی کی زبان ہے لیکن حقائق اس کے بھی خلاف ہیں۔ اگر دیانت داری کے ساتھ اعداد و شمار کو پیش کیا جائے تو عام فہم ہندی بولنے والوں کی تعداد سارے ملک میں ایک تہائی سے کسی طرح زیادہ نہیں ہے اور وہ بھی اس طرح سے جب یو-پی کے "اردو داں" طبقے کو نظر انداز کرکے کمایوں ڈویژن کے ان آٹھ پہاڑی اضلاع کو بھی ہندی علاقہ مان لیا جائے جہاں ایک فیصدی آبادی بھی نہ تو ہندی بولتی ہے نہ صحیح طور پر سمجھ سکتی ہے اور ۱۹۳۸ء میں جب یہ لسانی نقشہ منظور کیا گیا تھا تو مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق اس نقشہ کی زبان میں تقریباً پچاس فیصدی آبادی کی زبان اردو ہی تھی۔

صوبہ	اجمیر مارواڑ	بہار و اڑیسہ	دہلی	سنٹرل انڈیا
آبادی	۲ کروڑ ۸۰ لاکھ	۳ کروڑ ۲۵ لاکھ	۲ کروڑ	۲ کروڑ ۵۳ لاکھ

صوبہ	پنجاب	یو-پی	حیدرآباد دکن
آبادی	۵ کروڑ ۲۰ لاکھ	۵ کروڑ ۳۰ لاکھ	ایک کروڑ ۵۳ لاکھ

میزان ۲۳ کروڑ ۱۱ لاکھ ۵۰ ہزار

یہ اعداد و شمار اسی ۲۵ سال کے اندر کے ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں جب پہلی بار کانگریسی وزارتیں برسر اقتدار آئیں اور مسلم لیگ کا زور بڑھا تو زبان کا مسئلہ ایک اچھا خاصہ سیاسی مسئلہ بن گیا۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء کے آخر تک اس ایجی ٹیشن نے اتنا زور پکڑا کہ حکومت یو-پی کو بار بار اپنی صفائی دینی پڑی۔ اس زمانے میں آنجہانی پنڈت گووند ولبھ پنت یو-پی کے وزیر اعلیٰ تھے اور سمپورنانند جی وزیر تعلیم۔ ذیل میں حکومت یو-پی کا جاری کردہ ایک اعلانیہ پیش کیا جا رہا ہے جسے اگر یو-پی کی صوبائی حکومت کے موجودہ طریقہ کار کے آئینے میں

دیکھا جائے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کی دنیا میں قول و عمل کے اس تضاد کو کیا کہیں گے۔ حکومت یو پی کا یہ اعلانیہ گورنمنٹ پریس میں چھپا تھا اور یہ دو ورقہ میرے پاس بھی محفوظ ہے۔

اعلانیہ

بعض حلقوں میں عرصہ سے یہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ صوبجات متحدہ کی موجودہ (کانگریسی) حکومت ایک طرف تو ہندی کی حمایت کر رہی ہے اور اس کی ترویج و ترقی میں کوشاں ہے اور دوسری طرف یہ کوشش کر رہی ہے کہ اردو کو اس صوبہ (یو۔پی) سے نیست و نابود کر دیا جائے"۔۔ یہ غلط پروپیگنڈہ اتنی شدت سے کیا گیا ہے کہ اکثر ناواقف حضرات کو یقین ہو گیا ہے کہ یہ الزام واقعی درست ہے۔

مگر اصلی صورت حال یہ ہے کہ زبان کے مسئلہ میں موجودہ حکومت نے جو قدم اٹھایا ہے اگر اسے بغیر تعصب کے دیکھا جائے تو ہر صاحب انصاف یہ تسلیم کرے گا کہ اردو کے ساتھ موجودہ (کانگریسی) حکومت کا رویہ جتنا ہمدردانہ ہے اتنا آج تک کسی حکومت کا نہیں رہا۔

شاید اکثر حضرات کو یہ نہ معلوم ہوگا کہ کانگریس حکومت نے برسر اقتدار آنے کے بعد اردو ہندی کے محکمہ کو جو ۱۹۲۳ء میں توڑ دیا گیا تھا از سر نو قائم کر دیا۔ اس وقت اس محکمہ میں ایک سپرنٹنڈنٹ کے علاوہ ۳۷ اردو ہندی مترجم کام کر رہے ہیں۔ اس محکمہ میں تمام سرکاری بل۔ ایکٹ۔ مینول اور انتظامی رپورٹوں کا انگریزی سے ہندی اور اردو میں ترجمہ ہوتا ہے۔ عوام الناس کی جو درخواستیں اردو یا ہندی میں حکومت کے پاس آتی ہیں ان کو ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈال دیا جاتا بلکہ حسب ضرورت ان کا ترجمہ ذمہ دار حکام کے پاس روانہ کر دیا جاتا ہے۔ کانگریس حکومت جب سے قائم ہوئی ہے اسمبلی کے اجلاس کا "روزانہ ایجنڈا" انگریزی کے علاوہ اردو اور ہندی میں بھی تیار کیا جاتا ہے۔ اسمبلی کے ممبروں کو اختیار ہے کہ وہ اردو یا ہندی میں سوالات یا تقریریں کریں۔ ان سوالات کے جواب بھی اسی زبان میں حکومت کی طرف سے دئے جاتے ہیں اور جو تقریریں "ہندوستانی" میں ہوتی ہیں (جن میں وزیر صاحبان کی تقریریں بھی شامل ہیں) وہ اسمبلی کی مطبوعہ رپورٹ میں ہر دو زبان میں شائع کی جاتی ہیں۔ اسمبلی کے صدر ممبروں کو "ہندوستانی زبان" میں بولنے کا نہ صرف موقع دیتے ہیں بلکہ قانون حق اراضی پر مباحثہ کے دوران میں تو انھوں نے تمام ممبران کو ہدایت کر دی ہے کہ سب لوگ ہندوستانی ہی میں تقریر کریں۔

کانگریس حکومت نے محکمہ اخبارات اور محکمہ نشر و اشاعت کو ملا کر "محکمہ اطلاعات عامہ" قائم کیا ہے۔ اس محکمہ سے تمام سرکاری سرگرمیوں کی اطلاعیں صوبہ اور بیرونی صوبے کے اردو ہندی اخباروں کو روانہ کی جاتی ہیں۔ ہر پریس نوٹ اور کمیونکے کا بھی اردو ہندی ترجمہ اخبارات کے پاس بھیجا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ عوام کو حکومت کے مختلف محکموں کی سرگرمیوں اور وزراء کی تقریروں سے باخبر رکھنے کے لئے ایک ضخیم اردو رسالہ "[illegible]" اردو میں محکمہ کی طرف سے شائع ہوتا ہے اور صوبہ کی تمام لائبریریوں اور ذمہ دار اداروں کو مفت روانہ کیا جاتا ہے۔ علاوہ کتابت کے اخراجات کے اس رسالہ کی طباعت وغیرہ کا اوسطاً خرچ تقریباً ۴۸۵ روپیہ ماہوار ہوتا ہے۔ ہندی رسالہ کا اوسط ماہانہ خرچ تقریباً ۳۵۵ روپیہ ہے۔ محکمہ میں اکثر اردو کے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا جواب بھی اسی زبان میں لکھ کر روانہ کیا جاتا ہے۔ اردو میں زیادہ کام ہونے کی وجہ سے موجودہ حکومت نے "شعبہ اردو" میں مزید تقررات کئے اور اس وقت محکمہ اطلاعات عامہ میں ہندی کے چار اسسٹنٹ اور اردو کے سات اسسٹنٹ کام کر رہے ہیں۔ موجودہ حکومت کی یہ بھی پالیسی ہے کہ عوام کی واقفیت کے لئے سرکاری نوٹسیں اور اشتہارات اردو ہندی اخبارات میں کافی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اب اردو اور ہندی دونوں اخباروں میں برابر اشتہارات وغیرہ روانہ کئے جاتے ہیں جن کی تعداد پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔

صوبجات متحدہ کے محکمہ تعلیم نے دیہاتی حلقوں میں اشاعت تعلیم کی غرض سے ۶۰۰، دارالمطالعے اور ۳۶۰۰ کتب خانے کھولے ہیں۔ ان کے لئے حکومت نے تقریباً ۴۰۰۰۰ روپیہ کی اردو کتابیں اور تقریباً آٹھ ہزار روپیہ کے اردو رسالے اور اخبارات خریدے ہیں۔

کانگریس حکومت نے حال ہی میں ایک پریس مشاورتی کمیٹی بھی بنائی ہے جس میں اخبارات کے نمائندے شامل ہیں۔ اس کمیٹی میں دو ہندی اخبارات کے اور دو اردو اخبارات کے نمائندے ہیں۔ موجودہ (کانگریس) حکومت پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ سرکاری محکموں میں انگریزی الفاظ کے جو اردو ترجمے کئے جاتے ہیں وہ زیادہ تر "سنسکرت آمیز" ہندی میں ہوتے ہیں مثلاً یونائیٹڈ پروانسز (صوبجات متحدہ) کا ترجمہ "جُٹ صوبہ"۔ سپلی مینٹری کوئسچن (ضمنی سوالات) کا ترجمہ "دُم سوال" پلینٹف (مدعی) کا ترجمہ "جھگڑوا لیہیڑو"۔۔ اور ڈیفنڈنٹ (مدعا علیہ) کا ترجمہ "جھگڑوا [illegible]" ہوتا ہے۔۔۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ کسی سرکاری محکمہ میں اس قسم کے ترجمے نہیں ہوتے ہیں بلکہ جو ترجمے "قوسین" میں لکھے گئے ہیں اردو عبارت میں وہی استعمال کئے جاتے ہیں۔۔ اسی طرح یہ الزام بھی غلط ہے کہ اردو میں لیکن کی جگہ "پرنتو" استعمال کیا جاتا ہے یا تعلق کی جگہ "سمبندھ"۔

اس مختصر بیان سے واضح ہو گیا ہوگا کہ موجودہ حکومت اردو کے ساتھ مطلق زیادتی نہیں کر رہی ہے اور نہ اس کے مقابلے میں کسی صورت سے ہندی کو ترجیح دی جاتی ہے"۔

یہ اعلانیہ ایک تاریخی دستاویز کا درجہ رکھتا ہے۔ باوجودیکہ اس اعلانیہ میں سوائے دو ایک جگہوں کے ہر جگہ "اردو ہندی" کو مدغم کر کے اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں جن سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اردو کی صحیح پوزیشن کیا تھی۔ پھر بھی اتنا اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۸ء تک صوبائی حکومت کے محکمہ اطلاعات عامہ میں اردو کا کام ہندی سے کہیں زیادہ تھا۔ اسی لئے حکومت کو اردو اسٹاف میں اضافہ کرنا پڑا تھا اور آج کوئی پوچھ سکتا ہے کہ یو پی کے سرکاری دفاتر، اسکولوں اور عدالتوں میں "اردو" کی کتنی درخواستیں قبول کی جاتی ہیں؟ کتنی تعلیمی سہولتیں اردو کو حاصل ہیں؟

تبصرہ

تنقید و تجزیہ

مجموعہ مضامین ابو محمد سحر

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۰۰ صفحات، قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ: کتابستان - الٰہ آباد ۲

یہ مجموعہ دس تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے، جن میں سے سات مضامین نگار، اردو ادب اور دوسرے متعدد رسایل میں شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن اس مجموعے میں شامل کرنے سے پہلے ان پر نظر ثانی بھی کی گئی ہے۔

تنقید اور اصول تنقید" اقبال کے قومی تصورات اور عقیدہ وطن پرستی' اور امیر کی قصیدہ نگاری' اچھوتے مضامین ہیں' جو پہلے کہیں شائع نہیں ہوئے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر "تنقید اور اصول تنقید" کو اس مجموعے کا مقدمہ سمجھنا چاہیے۔ جس میں سحر صاحب نے ان اصولوں کی وضاحت کی ہے جو تنقید کرتے وقت ان کے پیش نظر رہتے ہیں۔

"غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ" بھی اس مجموعہ میں شامل ہے' جس میں معارف النغمات کو مولانا آزاد مرحوم کی تصانیف کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مولانا آزاد کی نہیں بلکہ راجہ نواب علی مرحوم تعلقہ دار اکبر پور (ضلع سیتا پور) کی تالیف ہے۔ جو خوش فکر شاعر اور موسیقی کے بڑے رسیا اور ماہر تھے۔ جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اس کتاب کا موضوع بھی علم موسیقی ہے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں نول کشور پریس نے اردو اور ناگری لیپی میں یہ کتاب شائع کی تھی۔

ابو محمد صاحب کے علاوہ اور بھی کئی حضرات کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے' اور اس غلط فہمی کا منبع غبار خاطر کا ایک جملہ ہے جس میں مرزا محمد ہادی رسوا کی اہلیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے برسبیل تذکرہ مولانا آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ معارف النغمات کی تالیف میں بھی انھوں نے مدد دی تھی۔

ان کا جملہ یہ ہے:

"...... اس مرتبہ [لکھنؤ میں] میرا قیام بہت مختصر رہا۔ لیکن جتنے دن وہاں رہا مرزا [رسوا سے] موسیقی کے مذاکرات ہوتے رہے۔ اسی زمانے کے کچھ بعد انھوں نے معارف النغمات کی ترتیب میں مدد دی۔"

یہ جملہ غبار خاطر کے آخری خط میں ہے' جس کے موضوع علم موسیقی ہے۔

تنقید و تجزیہ ہمارے ادب میں ایک مفید اضافہ ہے اور تنقید کے طالب علموں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

محمد عتیق صدیقی

پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا۔